حضرت سید احمد شہید
اور ان کی
تحریک اصلاح و جہاد
از
پروفیسر خلیق احمد نظامی

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ اصلاح وجہاد

اور

اس کے عمیق ووسیع اثرات

از

مؤرخ کبیر وفاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی

ناشر

دارِ عرفات دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

باراول

سنہ ۱۴۱۱ھ ـ جنوری سنہ ۱۹۹۱ء

نام کتاب ــــــــــــ سیّد احمد شہید اور ان کی تحریک اصلاح و جہاد

مصنّف ــــــــــــ پروفیسر خلیق احمد نظامی

صفحات ــــــــــــ ۴۴

تعداد ــــــــــــ ۲۰۰۰

کتابت ــــــــــــ حامد بستوی

طباعت ــــــــــــ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس (آفسٹ)

قیمت ــــــــــــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

پیش لفظ

سید محمد رابع حسنی ندوی

مجاہد کبیر امیر المومنین حضرت سید احمد بن عرفان الشہید رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اس برصغیر ہندو پاک کے لیے ایسی عظیم شخصیت گذری ہے جس نے اصلاحِ عقائد، تربیت باطنی، اعلائے کلمۃ الحق اور حج وجہاد جیسے اسلامی زندگی کے پرعزیمت کاموں کو نہ صرف قائم کیا بلکہ ان کو ان کے معیاری سطح پر جاری کیا، اور انفرادی دائرہ سے نکل کر اجتماعی اور امت کے دائرہ میں پوری طرح نافذ کرنے کی کوشش کی، چنانچہ ان کے ذریعہ اصلاح عقائد اور تربیت باطن کا جو عظیم کارنامہ انجام پایا، اس کے اثرات آج ان کی شہادت پر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ گذر جانے پر بھی جگہ جگہ پائے جاتے ہیں جو اپنی فلاح و اصلاح کا سلسلۂ نسب حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے مربوط جانتے اور مانتے ہیں، اور یہ اس بات پر مستزاد ہے کہ ہزاروں افراد کے داخل اسلام ہونے اور لاکھوں افراد کے

تعلق باللہ، توبہ وانابت، ترقی روحانی، توفیق شب بیداری اور ذوقِ دعا ومناجات کے حصول کا شرف حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے متبعین کی کوششوں کو حاصل رہا، مشرقی ومغربی بنگال اور نیپال تک ان کی نورانی کوششوں کے اثرات پہونچے اور وسط وشمالی ہند کے بیشتر روحانی وتعلیمی مراکز اپنا روحانی سلسلۂ نسب حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت ودعوت سے ملاتے ہیں،

حج خطرہ سے پُر ایسا رکن اسلام سمجھ لیا گیا تھا جو عدم استطاعت کے عذر کے تحت متروک ہونے لگا تھا، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ببانگ دہل عدم استطاعت کے عذر کو بے قیمت ثابت کیا، اور ایک مجمع کثیر (تقریباً سات سو افراد کے ساتھ) اس کو ادا کیا، جہاد جو مسلمانوں کی صرف کسی طاقت ور حکومت کا ہی فریضہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا تھا، اور کسی باہمت حکومت کے نہ ہونے کی صورت میں ہر ایک شخص نے اپنے کو اس سے مستثنیٰ سمجھ لیا تھا، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اس کی طرف توجہ کی بلکہ اپنے حلقۂ منتسبین کو اور جن افراد کو اس کے لیے آمادہ کر سکے، باقاعدہ اس کی تیاری کرائی اور پھر اس عظیم اسلامی عمل کو، جس کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ "جو اس طرح دنیا سے گیا کہ نہ اس نے جہاد کیا نہ اس کو جہاد میں شرکت کی خواہش ہوئی، وہ جاہلیت کی موت مرا" صرف انجام نہیں دیا بلکہ اس کو "کتاب وسنت" سے ماخوذ طریقہ کے مطابق جاری کیا اس میں "کتاب وسنت" کے مقررہ طریقہ سے انجام دینے میں بعض بڑے دنیاوی فوائد سے محروم ہونے کی صورت پیش آئی تو اس کو برداشت کیا لیکن اس عظیم اسلامی عمل کو

اس کے جادۂ حق سے ہٹنے نہیں دیا،

آج نہ معلوم کتنی متنوع دینی و اسلامی برکات ہیں جو برصغیر کی ملت اسلامیہ کو اسی تحریک و جدوجہد کے نتیجہ میں حاصل ہیں، جن کا ہم کو پورا احساس نہیں ہوتا، ضرورت یہ ہے کہ حضرت سید شہیدؒ کی دعوتی و اصلاحی کوششوں کو سمجھا جائے اور ان کے جو اجزا موجودہ "امت اسلامیہ ہند" کے حالات کے مطابق ہوں، ان کو اختیار کیا جائے، اس کے لیے حضرت سید شہیدؒ کی حیات اور کارناموں کو جاننے کی ضرورت ہے،

حضرت سید شہیدؒ کی حیات اور کارناموں پر اردو میں کئی مفید اور عظیم کتب شائع ہو چکی ہیں، ان میں سب سے وسیع، تحقیقی و مفصل کتاب مولانا غلام رسول مہرؒ کی ہے، اور دوسری مفصل اور مؤثر کتاب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی کی ہے، ان کتابوں سے حضرت سید شہید کے کارناموں اور حالات کو جاننے کے ساتھ ان کے فکر و عمل کے مزاج و روح کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے،

سالِ رواں ۹۰ء ماہ نومبر میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے مولانا سید محمد ثانیؒ تعلیمی سوسائٹی کے انتظام و ضیافت میں، حضرت سید شہیدؒ ہی کے وطن رائے بریلی میں (جہاں ان کی تحریک اصلاح و جہاد کی تیاری ہوئی تھی) "حمد و مناجات" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا، جس میں ملک کے طول و عرض سے فضلاء، اہل علم نے شرکت کی، اور حجاز و نجد سے بھی چند ادباء و اہل علم شرکت کے لیے تشریف لائے، ان شرکاء میں برصغیر کے مستند و عظیم مؤرخ و محقق پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی تھے، پروفیسر صاحب

موصوف کو اسلامی ہند کی تاریخ اور اس موضوع پر تحقیق اور بحث و نظر کا جو مقام حاصل ہے وہ کسی پڑھے لکھے شخص سے مخفی نہیں، اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر صاحب کو ہندوستان کے عظیم مصلحوں اور مربیوں سے عقیدت و محبت کا تعلق بھی ہے، اور وہ مشہور مربی روحانی و امام طریقت سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا سے انتساب رکھتے ہیں،

پروفیسر صاحب کو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی سے ایک خاص ربط و تعلق ہے، اس کی بنا پر مولانا مدظلہ العالی نے پروفیسر صاحب سے فرمائش کی تھی کہ سیمینار کا موضوع "حمد و مناجات" ہے اور وہ موضوع اور جگہ کے لحاظ سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذوق دینی اور عمل سے خصوصی تعلق رکھتا ہے، پروفیسر صاحب برصغیر کی دینی شخصیتوں کی تاریخ سے خصوصی دل چسپی رکھتے ہیں، اس لیے وہ اس موقع پر اپنے قیمتی مقالہ کا موضوع انہی کو بنائیں، پروفیسر صاحب کی بھی ایک عرصہ سے حضرت سید شہیدؒ کے کام و مقام" کو موضوع بنانے کی نیت تھی، لہذا انھوں نے بخوشی اس فرمائش کو نہ صرف قبول کیا بلکہ ایک وقیع مقالہ سپرد قلم کیا، جس میں علمی متانت، وسعت مطالعہ، تاریخی شواہد اور تاریخ وادب کی شگفتگی کا ان کا انداز نگارش پوری طرح نمایاں ہے، برجستہ و برموقع اشعار اور کلام اقبال نے اس کی تاثیر و حلاوت میں مزید اضافہ کیا ہے، جس کی بنا پر وہ محض ایک علمی و تاریخی مقالہ نہیں ہے، بلکہ ادب اسلامی کا بھی ایک وقیع تحفہ ہے۔ موضوع کی اہمیت اور مقالہ کی وقعت و افادیت کے پیش نظر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کو علاحدہ سے ایک علمی رسالہ کے طور پر شائع کیا جائے، اس

ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے، حضرت سید شہیدؒ کے وطن کے ہی ایک علمی ادارہ "دارِ عرفات" نے آمادگی ظاہر کی، چنانچہ یہ رسالہ "دارِ عرفات" کی طرف سے اور "رابطہ ادب اسلامی" کے تعاون سے شائع کیا جارہا ہے،

اس طرح دونوں متعلق اداروں کی شرکت ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ اس عمل کو مفید بنائے اور مقبول فرمائے، آمین

محمد رابع حسنی ندوی

"دارِ عرفات" رائے بریلی

۲۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ - ۱۰ر دسمبر ۱۹۹۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد و صلوٰۃ کے بعد اس حقیقت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ایک مدت سے راقم کو رائے بریلی حاضری کی تمنا تھی کہ اس فضا میں کچھ دیر سانس لینے کی سعادت میسر آئے جہاں حکمت ولی اللہی اور سوز علم اللہی نے مل کر نیا پیکر اختیار کیا تھا، اور جہاں سرفروشی اور جانسپاری کی تاریخ لکھی گئی تھی۔ رائے بریلی کو قدرت نے امتیازی خصوصیات سے نوازا ہے۔ یہ صدیوں سے علم و ارشاد کا گہوارہ، شریعت و سنت نبوی کا مرکز، اور دعوت و عزیمت کا منبع ہے۔ جس فیض کی ابتدا شاہ علم اللہؒ کی نوائے سحری، سید احمد شہیدؒ کے ذوق شہادت اور مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کے تبحر علمی سے ہوئی تھی وہ آج مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی ذات گرامی میں ایک نئی قوت بن کر نمودار ہوا ہے ؎

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

زمانے نے کروٹ بدلی ہے اور جہاد بالسیف کی جگہ جہاد بالقلم نے لے لی ہے۔ اور حضرت علی میاں نے اپنی زبان اور قلم سے جس طرح اسلام کی خدمت

کی ہے اس سے تاریخ دعوت و عزیمت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی قیادت میں حکمت ولی اللّٰہی ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے

ع آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

اُن کی ذات میں عشق، علم اور عمل تینوں کا اجتماع ہے ؎

ضمیر امتاں رامی کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

سید احمد شہیدؒ کے وطن میں حاضری ایک سعادت ہے۔ حیران ہوں کہ "سرِ خاکِ شہیداں" کیا نثار کروں کہ میرا دامن علم و عمل کی دولت سے خالی ہے

ع مگر میں نذر کو ایک آبگینہ لایا ہوں

یہ آبگینہ میرا دل ہے جو سید شہیدؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور احیاءِ ملّی کے لیے شبانہ روز کوششوں کے احسان کی گراں باری آج بھی محسوس کر رہا ہے ؎

سوزِ دل، اشکِ رواں، آہِ سحر، نالۂ شب
ایں ہمہ از اثرِ لطفِ شما می بینم !

(۲)

اسلام کی دینی فکر اور سماجی زندگی کا مرکزی نقطہ "توحید" ہے۔ بقول اقبال

یہی دین محکم، یہی فتح باب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

انفرادی زندگی ہو یا حیاتِ اجتماعی، جب یہ عقیدہ قلوبِ انسانی میں جاگزیں ہو کر احساس و شعور پر اثر انداز ہوتا ہے تو طلسمِ رنگ و بو ٹوٹ جاتا ہے اور انسانی زندگی میں توانائی کی نئی لہر، عزائم میں نیا ولولہ اور نظر میں نئی تابندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مالکِ حقیقی کے سامنے اس کا ایک سجدہ جو اس کو ہزاروں سجدوں سے نجات دلاتا ہے، ملّت کے لیے زندگی کا پیام ہوتا ہے۔ وہ ربِّ کائنات سے اپنا رشتہ جوڑ کر تخلیقِ کائنات کا مقصد پورا کرتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں توحید کی اس زندہ حقیقت کا احساس جب بھی کمزور پڑا، تو وہی کیفیت ہو گئی کہ

ع تھم گئی جس دم تڑپ، سیماب سیم خام ہے

سیّد احمد شہیدؒ نے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک دورِ ابتلاء و انتشار میں "توحید" کا یہ تصوّر اجاگر کرنے میں اپنی زندگی قربان کی تھی اور بتایا تھا کہ ؎

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں

گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ

خود ان کی زندگی "گفتارِ دلبرانہ" اور "کردارِ قاہرانہ" کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ وہ کل ۴۶ سال (۱۷۸۶ء - ۱۸۳۱ء) اس جہانِ فانی میں رہے۔ اس مختصر مدّت میں احیاءِ ملّت کے لیے جو جدّ و جہد و سعی کی وہ تاریخ بھلا نہیں سکتی۔ ان کی زندگی کا ۳۲ واں سال تھا جب انھوں نے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ اور اپنی "گفتارِ دلبرانہ" سے دینی احساس و شعور کو بیدار کرنے، اور اسلام کے اس نظامِ حیات کو سمجھانے میں جو صرف عقیدہ

"توحید کے گرد نشو و نما پا سکتا ہے، چار سال شب و روز جد و جہد کرتے رہے۔ پھر ۱۸۲۱ء
میں میدان عمل میں سر بکف داخل ہوئے، اور "کردار قاہرانہ" کا جیتا جاگتا نمونہ بن گئے
حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا آفتاب علم و ارشاد غروب ہوا چاہتا تھا کہ "سادات
قطبی ساکن رائے بریلی کا ایک بزرگ زادہ" ان کی خدمت میں پہونچا۔ اُن کی بوڑھی
ہڈیاں جس غم میں پگھلی جاتی تھیں اس کا درمان پیدا ہوگیا۔ ان کے فتوے کو عملی جامہ
پہنانے کے اسباب مہیا ہو گئے اور انھوں نے محسوس کیا

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

اس احساس نے کہ حکمت ولی اللہی کو کردار و عمل میں منتقل کرنے والا عالم وجود
میں آگیا اُن کی شمع زندگی میں نئی روشنی پیدا کر دی۔ اپنی مجلسوں میں ان کی "قوی نسبت
مجددی" دوسروں کو متاثر کرنے کی غیر معمولی قوت، اور بے حد ذکی القلب" ہونے کا ذکر بڑے
جذبے سے کیا (ملفوظات ص ۵، ۲۷)، ادھر خاندان ولی اللہی کی عظیم المرتبت شخصیتیں
جنھوں نے "حضرات ثلاثہ" کی صحبت میں تربیت پائی تھی، ان کے جھنڈے کے نیچے
اس طرح جمع ہو گئیں گویا اُن کے انتظار میں چشم براہ تھیں ؎

تو نخل خوش ثمر کیستی؟ کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش برید ند و در تو پیوستند

ان حضرات کا سید شہیدؒ کے دامن تربیت سے وابستہ ہونا، اعلان تھا اس
بات کا کہ اب حکمت ولی اللہی کا نیا دور ان کی قیادت میں شروع ہوگا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے

نواسے مولانا محمد یعقوبؒ کا بیان ہے کہ :-

"شاہ عبدالعزیزؒ کی توجہ کی تاثیر مثل ہلکے سے مینھ کے ہوتی ہے جس
کی چھوٹی چھوٹی بوندیں ہوتی ہیں۔ لیکن سید صاحب کی تاثیر مثل
لوہاروں کی پھکنی کے اثر کرتی ہے جو فوارہ کی طرح قلب پر پڑتا ہے۔"

(سوانح احمدی، جعفر تھانیسری ص ۱۴۱)

یہ فرق تھا ایک معلم اور ایک مجاہد کے اندازِ فکر و عمل کا۔ تجدید و تدوین علوم کا
کام ختم ہو چکا تھا، جہاد و عمل کا میدان کھل گیا تھا۔ مسند درس کی جگہ اب میدان کارزار
نے لی تھی۔ اس کے مرد میداں سید شہید تھے ؎

بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کف خاک
روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

(۳)

سید احمد شہیدؒ نے جس زمین میں آنکھ کھولی اور جس روح پرور فضا میں تربیت
پائی تھی وہ پھلت کی طرح "قریۃ الصالحین" تھا۔ یہاں شاہ علم اللہؒ نے اتباع سنت
کی وہ عظیم الشان روایت قائم کی تھی، جس سے اورنگ زیب عالمگیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا
تھا۔ شاہ غلام علی دہلویؒ کے ملفوظات "دُرُّ المعارف" میں ہے کہ اورنگ زیب نے
ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر علماء نے یہ بتائی کہ سنت نبوی کا کوئی زبردست اتباع کرنے
والا دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔ اسی رات شاہ علم اللہؒ نے وصال فرمایا۔

شاہ علم اللہؒ نے جب رائے بریلی میں اپنا رخت سفر کھولا اور قیام کا فیصلہ کیا تو یہاں کی دینی زندگی میں حرارت پیدا ہوگئی اور یہاں کے بام و در تکبیر و اذان کی صداؤں سے گونج اٹھے ۔ رفتہ رفتہ رائے بریلی حضرت مجدد صاحبؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ دونوں کی علمی، دینی، اور اصلاحی تحریکوں کا مرجع بن گیا۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید ع

چشم مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن

حضرت مجدد صاحب کے خلیفہ حضرت شاہ آدم بنوریؒ سے حضرت شاہ علم اللہؒ نے بیعت کی، اور ان سے خلافت اس بشارت کے ساتھ پائی کی تمہاری حیثیت ستاروں میں آفتاب کی ہوگی ۔ سید شہیدؒ کے نانا شاہ ابو سعید حسنیؒ نے شاہ ولی اللہؒ سے کسب فیض کیا ۔ ان کے متعلق شاہ ولی اللہؒ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"ایں راہ کہ میروند ہما طریق مستقیم است"

خطوط سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان ولی اللٰہی اور خاندان علم اللٰہی میں گہرا ارتباط اور تعلق تھا ۔ دونوں گھرانوں کی خواتین کے بھی آپس میں مراسم تھے ۔ شاہ ابو سعیدؒ نے مالی مشکلات میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مدد کی تھی ۔ شاہ ولی اللہؒ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"چنانچہ ایں نیاز مند را از فکر معاش نجات بخشیدند، اُو جل علا از جمیع حاجات از دین و دنیا ذات سامی را اخلاص و نجات عنایت فرماید۔"

شاہ ابو سعیدؒ، شاہ اہل اللہؒ، شاہ ابو اللیث حسنیؒ، شاہ محمد عاشقؒ شاہ عبد العزیزؒ کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ چنانچہ جس سرزمین میں سید احمد شہیدؒ نے آنکھ کھولی، وہاں احیاء ملت کی تحریکوں کا دل دھڑک رہا تھا۔

(۴)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ اشارہ کیا ہے کہ اگر موقع ومحل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا تھا (جلد اول ص ۱۰۱) حالات کا یہ تقاضا نہ تھا اس لیے وہ خاموش رہے۔ گو "فک کل نظام" کی صدائیں ان کی مسند درس سے بلند ہوتی رہیں (فیوض الحرمین)، کچھ عرصہ بعد جب حالات نے ایک مجاہد کو پکارا تو سید احمد شہیدؒ نے لبیک کہا اور ان ہی کے گرد خاندان ولی اللہی کے بہترین دماغ جمع ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی دینی اور اصلاحی تحریک سید احمد شہیدؒ کے ہاتھوں تکمیل کو پہونچی ؎

عمرہا در کعبہ وبت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا مرکز ومحور یہ اعتقاد تھا کہ توحید خالص کی حقیقی روح اگر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں واپس آجائے تو پھر ان کی زندگی کا نقشہ بدل جائے۔ ہندوستان کی تاریخ میں توحید کی سربلندی کے لیے عملی میدان میں جدوجہد کی اس سے بڑھ کر کوئی دوسری تحریک منصۂ شہود پر نہیں آئی

اس بنیادی مقصد کے حصول کے لیے سید شہید نے تین چیزوں پر زور دیا۔

احیاء سنّت

اماتت بدعت

تلقین جہاد

صحیح اسلامی روح بیدار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ بدعات کا خاتمہ کیا جائے اور زندگی کے ہر شعبہ میں سنّت نبوی کے اتباع کا جذبہ ابھارا جائے۔ عقائد کی اصلاح اور سماجی خرابیوں کا ازالہ، احیاء ملّت کے لیے ازبس ضروری تھا پھر سیاسی اقتدار کو غیر ملکی ہاتھوں سے نکالنے کے لیے جہاد کی روح پھونکنا وقت کا سب سے بڑا تقاضا تھا۔

اسلام کی دینی فکر میں جہاد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ احیاء ملت کے لیے یہ نسخہ اللہ کے صرف وہ بندے استعمال کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنے لیے جینا چھوڑ دیا ہو اور جن کی زندگی اور موت اپنے رب کے لیے ہو۔ عزم جہاد کرنے والے کو پہلے اپنے نفس سے جہاد پر کمر بستہ ہونا پڑتا ہے۔ خواجہ محمد معصومؒ نے شاہزادہ اورنگ زیب کے نام ایک خط میں جہاد کی اس اہمیت پر بڑے دلنشیں انداز میں گفتگو کی ہے۔ ہندوستان میں اللہ کی راہ میں جہاد کی تلقین، اور اس پر عمل کی سعادت سید شہیدؒ کے لیے مقدر تھی۔ انھوں نے اس تصوّر کو اس طرح مسلمانوں کے ذہن و دل پر نقش کر دیا کہ مدتوں تک انگریز مدبرین اور مصنفین کی کوششیں اسی تصور کو ذہن سے مٹانے میں صرف ہوئیں، اور ان ہی کے زیر اثر بعض علماء اور دانش وروں نے جہاد کو غیر اسلامی بتانے میں اپنی علمی صلاحیتیں

استعمال کیں۔

اقبالؔ نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ایک مشیر کی زبان سے کہلوایا ہے ؎

کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمان جدید

ہے جہاد اس دور میں مرد مسلماں پر حرام

فری لینڈ ایبٹ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قرون وسطیٰ کے وہ حالات جو جہاد کو کامیاب بنانے کا باعث تھے، سید احمد شہیدؒ کے زمانہ میں نہیں رہے تھے۔ گویا یہ بے وقت کی صدا تھی جو انھوں نے بلند کی (THE MUSLIM WORLD, JULY 1962) لیکن یہ خیال جہاد کی حقیقی نوعیت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اور اسی انداز فکر کا رجحان ہے جو مستشرقین نے عموماً سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے۔

برطانوی اقتدار کی طرف سے تصور جہاد کو مٹانے کی کوششیں ایک طرف پورے زور و شور سے جاری تھیں، دوسری طرف منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی فتوح الشام (واقدی) کا منظوم ترجمہ صمصام الاسلام کے نام لکھ کر اس تصور کو زندہ رکھنے کی جدوجہد جاری تھی۔ سید شہیدؒ کے بعد تصور جہاد پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے جو لکھا گیا ہے۔ اس کا تجزیہ بعض تاریخی حقائق کا پس منظر سمجھنے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ روح اسلامی کو مجروح کرنے کے لیے جہاد کے تصور کو مسلمانوں کے مذہبی احساس و شعور سے نکالا گیا تھا۔

(۵)

اسلامی تاریخ کے وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ عشق، علم اور عمل ــــــ ان تین قوتوں نے اکثر مل کر اور کبھی کبھی علٰحدہ علٰحدہ مسلمانوں کی حیات اجتماعی کو توانائی بخشی ہے۔ اور ان ہی کے ذریعہ اسلامی فکر و تمدّن کا قافلہ آگے بڑھا ہے۔ اور اثر و نفوذ کی قوتیں بروئے کار آئی ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ کبھی حالات کے تقاضے نے کسی مخصوص سمت میں ایک قوت کا رجحان زیادہ کر دیا لیکن مجموعی طور پر یہ صلاحیتیں اسلامی تاریخ میں مختلف عنوان سے سرگرم عمل رہیں۔ ہندوستان کی تاریخ پر اس زاویہ سے نظر ڈالی جائے تو پانچ شخصیتوں کے اثرات دوررس نتائج کے حامل نظر آئیں گے ــــــ خواجہ معین الدین حسن سنجری اجمیریؒ، شیخ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ احمد سرہندی مجدّد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سیّد احمد شہیدؒ ان کے کارناموں کی حقیقت اور ان کی مساعی کا رخ سمجھے بغیر ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا جائزہ ممکن نہیں۔

خواجہ اجمیریؒ اور حضرت محبوب الٰہیؒ نے "عشق" کو رہبر بنایا اور شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے الفاظ میں "دل کی دکانیں" لگادیں جہاں جذب و شوق، سوز و مستی کا سودا ملتا تھا۔ خود ان کی زندگیاں اس حقیقت کی ترجمان بن گئیں ؎

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفٰے
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

"صراط مستقیم" کے باب اوّل میں جس "تاثیر حُبّ عشق" کا ذکر ہے، یہ وہی عشق حقیقی ہے جس نے ان بزرگوں کے دل کو گرمایا تھا۔ اس کے ذریعہ انھوں نے اسلامی اثرات کا دائرہ وسیع کیا اور اسلام کی "وحدت خیز" قوت نے ہندوستان کی سماجی زندگی میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ راقم الحروف نے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM میں ہندوستان میں اسلام پر اپنے مضمون میں اس کو دورِ تبلیغ و اشاعت اور اثر و نفوذ سے تعبیر کیا ہے۔ پھر ایک ایسا دور آیا جب خود اسلامی معاشرہ کی اصلاح، وقت کا سب سے بڑا تقاضا بن کر سامنے آئی۔ اور سرمایۂ ملت کی نگہبانی کے احساس نے دلوں کو بے چین کردیا۔ اب عشق سے زیادہ علم کی ضرورت تھی تاکہ علم کے ذریعہ آنے والی گمراہیوں کا سدّباب کیا جاسکے۔ مجدد صاحبؒ نے سیاسی اقتدار کے پورے عروج کے زمانہ میں اُن غلط نظریات کی ترویج کو سختی سے روکا جو دربار سے نکل کر عوام کی زندگی پر اثرانداز ہو رہے تھے۔ انھوں نے مذہبی فکر کو احداث و بدعات سے پاک کیا۔ عقائد کا فساد جن فکری گمراہیوں کے سہارے بڑھ رہا تھا، اس پر بند لگائے، پھر شاہ ولی اللہؒ نے سیاسی انحطاط اور فکری انتشار کے زمانہ میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید کی طرف توجہ کی۔ اور جو نئی قوتیں اور نئے سماجی اور عمرانی نظریات ابھی کارگہ فکر میں تھے، ان سے نبرد آزما ہونے کا سامان مہیا کردیا۔ حجۃ اللہ البالغہ کا ایک ایک صفحہ پکارتا ہے ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

پھر سیداحمد شہیدؒ نے جب اپنی تحریک کا آغاز کیا تو حالات عمل اور جہاد کا مطالبہ کر رہے تھے، مجددصاحبؒ نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زمانہ میں کام کیا تھا، شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دور انحطاط میں نئے نظام کی تصویر دکھائی تھی، لیکن عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ سیداحمد شہیدؒ جب میدان میں داخل ہوئے تو حالات کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ انگریز پورے سامراجی عزائم کے ساتھ اپنے اقتدار کو جمانے میں مصروف تھے۔ اسلامی شعائر پر اضمحلال کی جو کیفیت طاری تھی اس کا اندازہ "صراطِ مستقیم" کے باب دوم کے مباحث سے لگایا جا سکتا ہے۔ عقیدہ توحید جس پر اسلامی سوسائٹی کے وجود کا انحصار تھا، غیر اسلامی تصورات میں الجھ کر رہ گیا تھا، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ :۔

تمدّن، تصوف، شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

مسئلہ صرف سیاسی اقتدار ہی کی واپسی کا نہیں تھا، بلکہ احداث و بدعات میں کھوئی ہوئی امت کی بازیافت کا تھا۔ اور اس کے لیے زندگی کے ہر شعبہ میں

مجاہدانہ جہد وسعی درکار تھی۔

سیاسی اقتدار نے دم توڑا تو معاشی حالات بھی بدل گئے۔ مسلمانوں کی زندگی سوز "لا الٰہ" سے محروم ہوئی تو خانقاہیں سیرت سازی کے کام سے نا آشنا ہو گئیں۔ اور مدرسے اپنے مقصد و منہاج کو بھول گئے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ بقول اقبالؔ ؂

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الّا
پیامِ موت ہے جب لا ہوا الّا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب بھی تاریخ ساز شخصیتوں نے اپنے کام کا آغاز کیا ہے، اپنے پیکر خاکی میں عزم اور ہمت کے سوتے اُبلتے ہوئے محسوس کئے ہیں۔ اُن کے دلوں میں اس اعتقاد اور یقین نے ایک جوش اور ولولہ پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے اس کام کی انجام دہی پر مامور ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ تفہیمات میں لکھتے ہیں:۔

"بہ سرم در دادند کہ ایں حقیقت بمردم برساں۔ امروز وقت وقت تست، وزماں زمان تو۔ وائے برکسے کہ زیر لوائے تو نباشد"

حضرت سید شہیدؒ کے دل میں بھی یہ خیال ایک قوت عمل بن گیا تھا کہ قدرت ان سے خاص کام لینا چاہتی ہے۔ اور وہ اس کی انجام دہی پر متعین ہیں۔ ایک خط میں

لکھتے ہیں :-

"فقیر دریں باب باشاراتِ غیبی ماموراست و بہ بشارتِ لاریبی مُبشَّر، ہرگز ہرگز شعبۂ وسوسۂ شیطانی و شائبۂ ہوائے نفسانی بایں الہام رحمانی مُمتزج نیست"

(خط ۳ ص ۳۰، برٹش میوزیم مخطوطہ)

اُس وقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر اور حکمت کے تمام اجزائے ترکیبی رائے بریلی میں جمع تھے اور سید احمد شہیدؒ ان کا علمی پیکر بن کر تاریخ کو نیا رخ دے رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا تو یہ خیال تھا کہ اگر شاہ ولی اللہؒ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو ان کو بھی حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (خلیفہ و رفیق تربیت یافتہ) سید احمد شہیدؒ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونا پڑتا۔ لکھتے ہیں :-

"حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع و کامل ہے؟ بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود تھا۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مردِ میداں کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا......

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو اُن ہی کے جھنڈے

کے نیچے نظر آتے"۔ (تذکرہ ص ۲۷۰)

پھر اصحاب ثلاثہ، یعنی شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ

اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:۔

"حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند

و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور

شاہ رفیع الدینؒ علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر

اُن کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں

ان کا فیضانِ علم کام نہ کر رہا ہو......... لیکن میدان والا معاملہ

کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک

ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چست آیا۔ دنیا اس کے خلعت

عظمت اور تشریف قبول کا ندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی"۔

مولانا آزاد کا یہ خیال بالکل صحیح ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معاملہ کچھ اور

آگے ہی نظر آئے گا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں سیکڑوں خاندان اور بے شمار

حکمراں اقتدار کے حامل بنے لیکن وہ گوشہ جہاں سید شہیدؒ نے اپنی تحریک کو منظم

کرنے کے لیئے اسلام کا سیاسی نظام نافذ کیا تھا، وہ اسلام کا حقیقی قدم تھا

جو اس سرزمین پر رکھا گیا۔ ہندوستان کے کسی اور حصے میں اور تاریخ کے کسی اور دور

میں قرونِ اولیٰ کا نظامِ حیات اس طرح ایک زندہ حقیقت کے طور پر چشم عالَم نے مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اَرض الہند کا یہ تھوڑا سا ٹکڑا، زمان و مکان کی ساری بندشوں کو توڑ کر عہد صحابہ میں جا ملا ہے۔

سیّد احمد شہید نے سرحدی علاقہ میں جو حکومت کا نظام قائم کیا تھا اُس کا مقصد اسلامی نظامِ حیات کا ایک نقشہ پیش کرنا تھا۔ انھوں نے عمل کیا تھا امام ابن تیمیہؒ کی اس ہدایت پر کہ بغیر امام مسلمانوں کی زندگی، غیر ملکی تسلط کے زمانہ میں منظم نہیں ہو سکتی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"قیام دین بملک است، واحکام دینیہ کہ تعلق بحکومت دارند، بوقت نبودن مملکت صاف از دست می روند"

اُن کی نظر آفاقی تھی، اُن کا مطمحِ نظر یہ تھا:۔

"ایں قدر آرزو دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ جمیع اقطار عالم احکام حضرت رب العالمین کہ مسمیٰ بشرع متین است بلا منازعت احدے نافذ گردد"

پہلے دعوت اور اس کے بعد عزیمت اور عمل سنّت نبویؐ ہے۔ جب کسی تحریک کا آغاز ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی فکری اساس مضبوط کی جاتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ معظمہ میں آیات مکّی کے ذریعہ تمام انسانیت کو مخاطب کر کے اپنا پیغام پہونچا دیا۔ پھر مدینہ منوّرہ میں ان اصولوں کو زندہ حقیقت بنا کر پیش کیا اور

خطاب مومنین سے کیا کہ اُن پر اس نظام کو چلانے کی ذمہ داری تھی۔

سید احمد شہیدؒ نے اپنی زندگی کے کئی سال ذہنی فضا کے تیار کرنے میں صرف کئے اور پھر جہاد کی تیاری میں لگ گئے۔ اور بالآخر اللہ کے اس فرمانبردار بندے نے اپنی زندگی اس کی راہ میں اس طرح قربان کردی کہ فضائیں تک پکار اٹھیں ؎

ظہور عشقِ حقیقت طراز تھا ورنہ

یہ دل کشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

سید احمد شہیدؒ نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کو سب سے بڑا صدمہ بیرونی اقتدار سے پہونچا ہے چنانچہ انھوں نے ملک کو غیر ملکی تسلّط سے نجات دلانا اپنے جہاد کے مقاصد میں شامل کیا۔ گوالیار کے ہندو راؤ اور چترال کے شاہ سلیمان کے نام ان کے خطوط، ان کے مقاصد کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ ہندو راؤ کو لکھتے ہیں:۔

"بررائے سامی روشن و مُنیر ہمن است کہ بیگانگاں بعید الوطن ملوک زمین و زمن گردیدہ و تاجران متاع فروشں بپایۂ سلطنت رسیدہ، امارت امرائے کبار و ریاست رو سائے عالی مقدار برباد نمودہ اند عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ۔ چوں اہلِ ریاست و سیاست در زاویۂ خمول نشستہ اند، ناچار چندے اہل فقر و مسکنت کمر ہمت بستہ ایں جماعت ضعفا محض بنا برخدمت دین رب العالمین برجستند"

ہندو راجہ سے یہ کہنا کہ "دین رب العالمین" کی خدمت کا جذبہ میدان میں
لایا ہے، بے حد اہم ہے۔ غلام حیدر خاں کے نام مکتوب میں بھی انھوں نے اس
"جور و ظلم" کا ذکر کیا ہے جو انگریزوں نے ملک پر ڈھائے تھے۔ اُن کی آواز میں اللہ
نے غضب کی تاثیر دی تھی، جس کو سن کر نہ صرف دل سینوں میں تڑپنے لگتے تھے بلکہ
سر جسم پر بوجھ بن جاتا تھا اور ذوق شہادت میں لب پر دعا آجاتی تھی ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

ہندوستان کی تاریخ میں جان قربان کرنے کے لیے ایسا جذبہ پھر کبھی نظر
نہیں آیا۔ جب در و دیوار سے یہ صدائیں آتی تھیں۔

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
حبیب حبیبِ خداوند ہے
خداوند اس سے رضا مند ہے
امامِ زمانہ کی یاری کرو !
خدا کے لئے جاں نثاری کرو

(مومن)

مائیں، لوریوں میں اپنے بچوں کے لئے شہادت کی دعائیں مانگنے لگیں۔
انسانی جذبات کا یہ تلاطم اسلامی ہند کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ امروہہ کے

شاہ محمد امین غازی حضرت شہیدؒ کے زمرۂ مجاہدین میں شامل تھے۔ ایک مثنوی میں
اپنے اکلوتے بیٹے روح الامین کے لئے دعا کرتے ہیں۔

چناں خواہم آں پاک پروردگار
کہ روح الامیں راکند بختیار
مجاہد چنانش کند اندر غزا
کزو تا رسد بر نصاریٰ سزا

اُن کی "مثنوی فیروز شاہ" کا ایک نادر قلمی نسخہ خاکسار کے ذخیرۂ کتب میں ہے
جس سے ان کے جذبات و احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان میں اب تک مسلمان حکومتوں کی طرف سے دو جنگیں لڑی جا چکی
تھیں —— جنگ پلاسی اور جنگ سرنگاپٹم۔ یہ سید شہیدؒ کے منصۂ شہود پر آنے
سے پہلے لڑی گئی تھیں۔ جنگ بالاکوٹ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی عوامی جنگ
تھی جو آزادی، حرّیت اور اخلاقی قدروں کے احیاء کے لئے مسلم عوام نے سید شہیدؒ
کی قیادت میں لڑی۔ مومنؔ نے جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے دامن تربیت سے وابستہ
تھے، مثنوی جہادیہ میں لکھا تھا ؎

ایں عیسویاں بہ لب رسانند
جان من و جان آفرینش
مگذار کہ پائمال گردیم!
زاں سیم سران آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی
فارغ ز فغان آفرینش!

مومن شدہ ہم زبان عرفی
از بہر اماں آفرینش

برخیز کہ شور کفر برخاست
اے فتنہ نشان آفرینش

یہی انداز مولانا محمد امین غازی کا تھا۔ لکھتے ہیں:۔

زبد دینی حاکمان زمن
نشان حیا نیست در مرد و زن
زبد دینی حاکمان زمن
حیا روئے پوشید و رفت از جہاں
بجاں آمدیم از تعدی شاں
بسے الاماں المدد الاماں

مولانا خرم علی بلہوری نے قصیدہ جہادیہ لکھا جو اتنا پُر تاثیر تھا کہ مجاہدین لڑائی کے وقت اس کو پڑھتے تھے اور بے خود ہو جاتے تھے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ نے کلکتہ سے لے کر بالاکوٹ تک جہاد کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اُن کی نگاہ کی یہ تاثیر تھی کہ جس کی طرف دیکھ لیا وہ دار و رسن کی تمنا میں اپنے روز و شب بسر کرنے لگا۔ اسلامی ہند کی تاریخ میں کوئی اسلامی تحریک ایسی نمودار نہیں ہوئی تھی جس کا دائرۂ اثر و نفوذ اتنا وسیع ہو اور جس نے ہر چھوٹے بڑے کے دل کو جذبۂ جہاد سے گرمایا ہو۔ سر سید کا بیان ہے:۔

"شہر کلکتہ میں جب تک آپ نے تشریف رکھی، شراب مطلق نہ بکنے پائی۔ اور کلال خانہ بند رہا اور اس نواح میں آپ کے مریدوں کی تعداد لکھوک سے گذر گئی۔" (آثار الصنادید)

وہ کلکتہ میں ساڑھے تین یا پونے چار مہینے ٹھہرے تھے۔ پرنسپ (PRINCEP) کے بیان کے مطابق کلکتہ کے باشندوں کی بڑی تعداد اس زمانہ میں اُن کی پیرو ہو گئی تھی۔ بقول حسن ؎

تیری تائید سے اک خلق ہوئی ہے تائب
تیری تنبیہ سے لاکھوں ہوئے فاسق اطہر

روسی مصنف جو ہر تحریک میں مزدور اور کاری گر طبقوں کی شرکت سے اس کی اہمیت اور دائرہ اثر و نفوذ کا اندازہ کرتے ہیں، اس تحریک کے عوامی رنگ سے متاثر ہیں۔ E.N. KAMAROV کا خیال ہے کہ تحریک نے Lower urban stratum نچلے شہری طبقے کو خاص طور پر متاثر کیا تھا۔ لکھتا ہے :۔

Its main force were the popular masses

(NEW THOUGHT, FEB. 1, 1958)

اس نے ایک برطانی افسر کی رپورٹ کا ذکر کیا ہے جس میں اس نے اعظم گڈھ کے نوربافوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سید شہیدؒ کی تحریک سے متاثر ہو کر آمادۂ بغاوت ہو گئے ہیں۔

جن حلقوں سے سید شہیدؒ پر اعتراض کئے گئے ہیں اُن کی آنکھیں جذبات کے اس طوفان کا ساحل سے بھی نظارہ نہ کرسکیں جو انھوں نے ہمالیہ کی چوٹیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک پیدا کر دیا تھا۔

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی ساری مذہبی، سیاسی اور اصلاحی تحریکیں سید شہیدؒ کے گرد جمع ہوگئی تھیں اور اسلامی ہند کا مرکز ثقل ان کی طرف منتقل ہوگیا تھا۔ خاندان ولی اللٰہی تو اُن کے گرد جمع تھا ہی، ٹیپو سلطان کے خاندان کے وہ افراد جو ان حریت پسندانہ سرگرمیوں کے باعث ویلور کی سرکشی کے بعد کلکتہ منتقل کر دیے گئے تھے، حضرت شہیدؒ کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوگئے۔ دکن میں نواب مبارزالدولہ نے سید شہیدؒ کے نمایندوں سے رابطہ اور تعلق پیدا کیا، بنگال میں فرائضی تحریک نے مجاہدین کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ میر نثار علی عرف تیتو نے حضرت شہیدؒ کے دامن میں پناہ لی۔ انھوں نے ۱۸۳۱ء میں نرکل بریا میں بانسوں کی ایک مضبوط فصیل بنائی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ تعجب خیز واقعہ ہے کہ بالاکوٹ اور نرکل بریا، دونوں مقامات پر ــــ جن کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے ــــ شہادت کے میدان ایک ہی وقت میں گرم ہوئے اور مجاہدین کے قافلہ سالار حضرت سید احمدؒ نے بالاکوٹ کے میدان میں جام شہادت پیا، اُدھر بنگال میں نرکل بریا

کے میدان میں مجاہدین کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے ۔ جو مجاہدین بچ گئے وہ علی پور جیل پہونچادیے گئے، اور بس ۔

پھر نہ کچھ دیکھا، بجز یک شعلۂ پر پیچ وتاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا!

حضرت شہیدؒ کے مکتوبات اُن کی تحریک جہاد کے مقاصد، اُن کے طریقۂ کار اور اُن کے نظام حکومت کے بنیادی اصول سمجھنے میں بے حد معاون ہیں ۔ یہاں چند اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی جا سکتی ہے :-

(۱) انہوں نے بار بار اس کی وضاحت کی ہے کہ انھوں نے محض اللہ کی خاطر جہاد کا قدم اٹھایا ہے ۔ حکومت واقتدار، مال ودولت ان کا مقصود ومطلوب نہیں ۔ اقبال کا یہ شعر ان کے مقاصد کا بہترین ترجمان ہے ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن
نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشائی

اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اپنے بنیادی مذہبی افکار کو ایک صالح نظام حکومت کی شکل دینا نہیں چاہتے تھے ۔ اس نظام کے بغیر وہ "توحید" کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش نہیں کر سکتے تھے ۔ انھوں نے کابل، ہرات، بخارا وغیرہ کے حکمرانوں کو اپنی تحریک کے مقاصد سے واقف کرانے کے لیے خطوط لکھے تھے ۔ جن سے ان کے دینی مقاصد پر روشنی پڑتی ہے ۔ شاہ سلیمان والیٔ چترال کے نام خط میں انھوں نے (۱) حکومت کے

نصاریٰ کے ہاتھ میں پہنچ جانے، (۲) غلبہ شرک وکفر اور (۳) شعائرِ اسلام کے خاتمہ پر اپنے دل کی بے چینی کا اظہار کیا ہے۔ اور یہی تین مقاصد اُن کی تحریک کے تھے۔

(۲) علاقہ بالاکوٹ کا انتخاب کرنے سے پہلے انھوں نے "ہندوسندوخراسان" کے سب اہم مقامات کا سفر کیا تھا اور تحریک کا BASE OF OPERATINO بنانے کی نظر سے جائزہ لیا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"در بلاد ہندوسندوخراسان دوروسیر نمودیم در تمامی آئین سیاحت
کوہ ودشت فقط طالب خیر بودیم۔ آخر الامر در مثل ایں بلاد دردست
گردیدہ وتمامی ایں کوہ ودشت نور دیدہ را اوطان یوسف زئی رسیدیم"
(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ص ۲۰)

"شوق ہجرت"، "غیرت ایمانی" اور "جوشِ اقامت جہاد" کی خاطر وہ علاقہ بالاکوٹ میں پہونچے تھے اور یہاں پہونچ کر انھوں نے محسوس کیا ؎

ایک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

اس زمین کے لیے مشیت ایزدی نے یہ شرف وافتخار مقدر کیا تھا کہ یہاں عشق الٰہی سے سرشار ایک قافلہ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرنے کے لیے پہونچے گا۔

لیکن بالاکوٹ کو مرکز بنانے کا فیصلہ جذباتی نہیں تھا۔ یہ حقائق کی روشنی میں،

مصالح کے پیش نظر تھا جس کا اندازہ مکتوبات سے ہوتا ہے۔

(۳) مجموعۂ مکتوبات میں بعض "امان نامے" بھی نقل کئے گئے ہیں۔ اُن سے مقاصد اور وسیع حلقۂ اثر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک "امان نامہ" سوبہا اور تلسی کے نام اس مضمون کا ہے:۔

"امان نامہ بنام سوبہا و تلسی و گنگو و سونہا مع پسران بشرط بجا آوری خدمت لشکر"

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ص ۲۶۶)

پھر ایک مسلمان کے لئے "امان نامہ" کا مضمون ہے:۔

"سلام الدین و فقیر محمد و عباس از اولاد میاں مصری بشرط اتباع شرع و ادائے زکوٰۃ وغیرہ حقوق اللہ"

(قلمی نسخہ ص ۲۶۶)

ان دو "امان ناموں" میں اسلامی نظام حکومت کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں سے تعلقات نہایت خوشگوار رکھے۔ اسمتھ (W.C. SMITH) نے تحریک کے سیاسی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کا کوئی رُخ ہندوؤں کے خلاف نہیں تھا۔

None of these political activities however was anti-hindu

(MODERN ISLAM IN INDIA P. 192)

"ان کی سیاسی سرگرمیوں میں کوئی بات ہندوؤں کے خلاف نہیں تھی۔"

تحریک کا سکھوں کے خلاف ہونا بھی اب تاریخ سے ثابت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جو طاقت بھی راہ میں حائل نظر آئی اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہو گیا، لیکن بنیادی طور پر تحریک کا مقصد سکھوں سے نبرد آزمائی نہیں تھی۔ مکتوبات میں جس طرح "نصاریٰ نکوہیدہ خیال" کی جگہ "سکھان نکوہیدہ خصال" اور "کفار فرنگ بر ہندستان تسلط یافتہ" کو "کفار دراز مویان کہ بر ملک پنجاب تسلط یافتہ" میں تبدیل کیا گیا ہے وہ تاریخ کی انتہائی شرمناک جعل سازی ہے۔ لیکن اس کا تجزیہ کرتے وقت غیر ملکی اقتدار کے اُن مظالم پر نظر ہونی ضروری ہے جن سے مجبور ہو کر یہ تحریفیں کی گئی تھیں۔

(۴) مکتوبات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ جنگ و جدال کا دائرہ مختصر رکھنا چاہتے تھے۔ اپنے صلح اور امن کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے، لالہ رام سنگھ کو جنگ بالاکوٹ سے دو سال قبل (۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء کو) لکھتے ہیں:-

"من بندۂ پروردگارم۔ ہر کس کہ پیغام صلح فرستد از طرف خود جنگ پیش نمی کنم"

ظاہر بین نگاہوں کو شاید ۱۸۳۱ء میں تحریک جہاد کا خاتمہ نظر آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ

جلے، جل کر بجھے بھی چشمِ صورت بیں میں پروانے
فروزاں کر گئے وہ نام لیکن شمعِ سوزاں کا!

وقتی طور پر اُن کو ناکامی ضرور ہوئی لیکن اُن کی تحریک نے سرفروشی کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا وہ ایک عرصہ تک قلب و جگر میں شعلہ کی طرح بھڑکتا رہا اور بقول اقبال

ع زآتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

سرسیدؒ کا بیان ہے کہ سید شہیدؒ کے چودہ پندرہ سال بعد تک مجاہدین جہاد کے جذبہ سے سرشار سرحدی علاقوں میں "بہ نیت جہاد" پہونچتے رہے۔

انگریزوں نے مجاہدین کے ساتھ جو ظالمانہ برتاؤ کیا اور اُن کی بیخ و بن اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی، وہ تاریخ بھلا نہیں سکتی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے جن علماء و مجاہدین کو خاص طور پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اُن میں خاص تعداد مجاہدین کے گھرانوں کی تھی۔ ۱۸۶۴ء کے ابنالہ بغاوت مقدمہ، ۱۸۶۵ء کے پہلے مقدمہ بغاوتِ پٹنہ، ۱۸۷۰ء کے مالدہ بغاوت کیس اور راج محل بغاوت مقدمہ اور ۱۸۷۱ء کے دوسرے پٹنہ بغاوت کیس میں مجاہدین کے خاندان جس طرح برطانوی مظالم کا شکار بنے اُن کی داستان دردناک ہے۔ "الدر المنثور" میں مولانا عبدالرحیم نے اپنے چچا مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور دیگر مجاہدین کے حالات لکھے ہیں۔ ۱۸۶۵ء میں عید کے دن اُن کے مکانوں کو جس طرح مسمار کیا گیا، اُس کا حال مولانا عبدالحمید نے ایک مثنوی میں لکھا ہے:۔

چوں شبِ عید را سحر کردند

ہمہ را از مکاں بدر کردند !

ضبط و تاراج جملہ مال و متاع
اشتر و فیل و گاہ و اشتر و اسپ
باغ را و منازل دل چسپ
آں بناہائے شامخ و محکم
کہ بہ گیتی بود عدیلش کم !
اندراں خانہ طالباں چوں نجوم
روز و شب مشتغل بہ درس علوم
جملہ دیوار و سقف و خانہ و در
بیل زن کردہ منہدم یکسر

ہندوستان میں جنگ آزادی کی تاریخ سید شہیدؒ سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے خون سے آزادی کے جس پودے کی آبیاری کی تھی، وہ ایک ایسے وقت میں برگ و بار لایا جب کوتاہ بین نظریں ان گذرگاہوں کو بھول چکی تھیں جہاں سے حرّیت اور آزادی کے ان علم برداروں کا قافلہ گذرا تھا۔

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ جنگ آزادی سید شہیدؒ کی عظیم الشان تحریک کا صرف ایک پہلو ہے۔ بعض اوقات ہم کسی ایک پہلو پر اس طرح سے نظریں مرکوز کر دیتے ہیں کہ تحریک کی مجموعی حیثیت اور اس کے

مقصد و منہاج کے متعلق محدود تصورات نشو و نما پا جاتے ہیں۔ سید شہید جس مقصد
کے لیے میدان عمل میں داخل ہوئے تھے وہ عقیدۂ توحید کو مسلمانوں کی حیات اجتماعی
میں ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے بیدار کرنا تھا۔ وہ یہ احساس پیدا کرنا چاہتے
تھے کہ ہے زندہ وحدتِ افکار سے ملّت

وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوّت بازو

آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد

عقیدۂ توحید سے جو نظام وجود میں آتا ہے اس میں انسانیت کے لیے فوز
و فلاح کا پیغام ہے۔ "تقویت الایمان" میں توحید کو زندگی کے ہر شعبہ میں ایک
زندہ حقیقت کی حیثیت سے دیکھنے اور بدعات سے اس تصوّر کو پاک کرنے کی کوشش
براہ راست دل پر اثر کرتی ہے اور یہ احساس شدید ہو جاتا ہے کہ ؎

زندہ قوّت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی

آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام

سید شہیدؒ کی تحریک جہاد کو اسلام کی تاریخ کے وسیع چوکٹے میں سمجھنے اور پیش
کرنے کی ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ اس تحریک کے فکری اثرات کا جائزہ پورے طور پر نہیں لیا گیا۔
بعض معاصرین نے جو سید شہیدؒ کے خلوص، جذبہ اور جد و جہد سے بے حد متاثر تھے

سیاسی حالات کے پیش نظر بعض پہلوؤں کو دبا کر پیش کیا۔ سرسید نے انگریز کے انتقامی جذبے سے بچانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ بعض حلقوں میں اُن کی تحریک جہاد کو تو نظر انداز کر دیا گیا، اُن کی خانقہی نظام کی تنقید کی نشانۂ ہدف بنالیا گیا۔ ضرورت ہے کہ تحریک کے اثرات کا جائزہ وسیع پس منظر میں لیا جائے۔

سرسید، اُن کے معاصر تھے۔ جب آثار الصنادید لکھنے بیٹھے تو ۱۴،۱۵ سال سید احمد شہیدؒ اور مولانا محمد اسمٰعیلؒ کی شہادت کے ہو چکے تھے، لیکن جب ان کا حال لکھا تو اُن کا قلم وجد کرنے لگا۔ اُن کے حرف حرف سے عقیدت اور محبّت کا جذبہ ٹپکتا تھا۔ سرسید کو تقلید سے آزادی اُن ہی کی تحریک سے ملی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مولانا محمد اسمٰعیل شہید کا پیرو بتاتے تھے اور "تقویت الایمان" کے متعلق کہتے تھے کہ یہ محبّت الٰہی" میں لکھی گئی ہے (خطوط ص ۳۰،۷) انھوں نے ایک رسالہ "راہِ سنّت ور دِ بدعت" لکھا تھا جس میں یہ اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ حالی نے "حیات جاوید" میں لکھا ہے:

"مولانا اسمٰعیل شہید کی تصانیف نے ان کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی"۔ (حیات جاوید ص ۴۰۴)

اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی اور مذہبی اصلاح کی تاریخ مولانا سیّد احمد شہیدؒ سے شروع ہوتی ہے۔ بعد کو سرسید نے اُن کی تقلید میں قدم آگے بڑھایا لیکن اُن کے حالات اور مسائل اور تھے، اس لیے اُن کی تحریک دوسرا رُخ اختیار کر گئی۔

پھر حالی بھی سیّد شہیدؒ اور خاندان ولی اللّٰہی کی مذہبی سرگرمیوں سے متاثر ہوئے

بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے ایک زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں کی تائید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ ایک بار غالب کو نماز کی پابندی نہ کرنے پر مذہبی اور احتسابی انداز میں متوجہ کیا تھا اُن کی "بیوہ کی مناجات" سید شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک نکاح بیوگان کی صدائے بازگشت ہے۔ وہ سوشل ریفارم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مسلمانوں میں ظاہرا دو شخصیتوں کے سوا کہ دونوں دلّی کی خاک سے اُٹھے، کسی نے سوشل رفارم پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسمٰعیل، دوسرے سید احمد خاں" (حیات جاوید ص ۱۴۶)

سرسید، مولانا اسمٰعیلؒ کی حق گوئی کے قائل تھے اور یہ ایک ایسا وصف تھا جس کی اپنے عہد کے علماء میں کمی پاتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"میں بڈھا ہوں اور اپنی عمر میں ہر فرقہ کے بہت بڑے بڑے شخصوں کو دیکھا ہے۔ اسی چیز نے اور اسی خیال نے کلمۃ الحق کے کہنے سے ان کو باز رکھا۔ مولانا اسمٰعیل شہید اگر اسی قسم کے خیالات میں مبتلا رہتے تو ہندوستان میں شرک و بدعت کی تاریکی کیسے دور ہوتی۔"

(خطوط ص ۱۶۹)

بعد کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد، سید شہیدؒ کی تحریک جہاد کے زبردست معترف تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالرحیم کی "الدر المنثور" پر اپنی نوجوانی میں مقدمہ لکھا تھا۔ اُن کے استاذ مولانا محمد یوسف رنجور کے باپ مولانا محمد یحییٰ علی تحریک مجاہدین

کے زبردست مبلغ تھے۔ اُن کی ساری جائداد ضبط کر لی گئی اور اُن کو انڈمان بھیج دیا گیا۔ وہاں سے انھوں نے اپنی اہلیہ کو خط لکھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ تم کو اس آزمائش کے لیے منتخب کیا گیا"۔ یہ جذبہ جاں سپاری، سیّد شہید کی سرکردگی میں ہر مجاہد کے دل کو گرمائے ہوئے تھا۔ مولانا آزاد کے دو رفیق —— اجمل خاں اور ہمایوں کبیر —— مجاہدین کے خاندان سے تھے۔ مولانا آزاد نے "تذکرہ" میں جس طرح سیّد شہیدؒ کی تحریک کو اسلام کی تاریخ عزیمت میں جگہ دی ہے، وہ اُن کی فکر کے بنیادی خطوط کو روشن کرتی ہے۔ ایک ایک لفظ سے عقیدت کا جذبہ اور اتباع کا جوش ٹپکتا ہے۔ وہ حال اپنا لکھ رہے تھے، لیکن سیّد شہیدؒ نے اُن کی شخصیت پر جو اثر ڈالا تھا، اس کے پیش نظر وہ اُن کو بھلا نہ سکتے تھے۔ ایک بار خاکسار سے گفتگو میں فرمانے لگے: میرے والد کی ولادت ۱۸۳۱ء میں ہوئی تھی، اسی سال جب جنگ بالاکوٹ لڑی گئی تھی۔ اتنا جملہ کہہ کر انھوں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ ماضی کے گریز پا نظاروں کو اپنے تصوّر میں مقید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب آنکھیں کھولیں اُن میں ایک خاص چمک تھی۔ اُن کے باپ اگر جنگ بالاکوٹ کے سال میں پیدا ہوئے تھے، تو انھوں نے اپنی زندگی اس مسلک اور ان مجاہدانہ سرگرمیوں کی تائید میں صرف کر دی جو سیّد شہیدؒ کی جہد و سعی کا مرکز و محور تھا۔ ضرورت ہے کہ مذہبی، ادبی، سماجی، سیاسی سب میدانوں میں سیّد شہیدؒ کی تحریک کے عمل اور ردِّ عمل کا تجزیہ کیا جائے۔ سرسیّد، حالیؔ، آزاد اپنے مخصوص میدانوں میں ممتاز تھے، لیکن

تینوں سید شہیدؒ کی تحریک سے متاثر تھے۔ ہنٹر (HUNTER) کے بیانات کتنے ہی متعصبانہ ہوں، لیکن اُن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سید شہیدؒ کے اثرات کا دائرہ کتنا وسیع تھا اور حکومت ان سے کتنی خائف تھی۔ جب ۱۸۹۴ء میں، واقعۂ بالاکوٹ کے ۶۳ سال بعد حکیم سید عبدالحی صاحبؒ نے شمالی ہندوستان کے بعض اہم مقامات کا دورہ کیا تو اُن کو سید شہیدؒ کے خاندان کے چشم و چراغ کی حیثیت سے سر اور آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ مولانا ذوالفقار علی نے ان کو بتایا تھا کہ سید صاحبؒ جن جن قصبات میں تشریف لے گئے وہاں اب تک خیر و برکت کا ماحول ہے "گویا ایک نور مستطیل ہے کہ جدھر گئے اُدھر وہ پھیل گیا"[1]

سید صاحبؒ کے معاندین نے اُن کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے مستشرقین اگر ایک طرف سیاسی مصلحتوں سے مجبور تھے تو دوسری طرف اُن کی محرومی یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی دینی، ملّی اور فکری تحریکوں کے خاموش اشاروں کو سمجھنے سے معذور تھے۔ وہ رائے بریلی کو ایک غیر معروف قصبہ اور سید شہیدؒ کو ایک غیر معروف خاندان کا فرد، اور بعض قزاقوں کے قبیلے سے متعلق سمجھتے رہے۔ حالانکہ رائے بریلی میں اس وقت اسلامی ہند کا دل دھڑکتا تھا اور سید احمد شہیدؒ سادات حسنی کے چشم و چراغ تھے۔ دہلی سے حکمت ولی اللّٰہی کا چشمہ رائے بریلی پہونچ چکا تھا اور ایک دوسرے سفر کی تیاری میں مصروف تھا۔ لیکن

---

[1] دہلی اور اس کے اطراف از مولانا حکیم سید عبدالحی ص ۱۱۴ ـ ۱۱۵

ان کی نگاہیں ان حقائق کا جائزہ نہ لے سکیں۔ Hughes ،Hardy ،Caroe O وغیرہ کے بیانات تعصب اور جہالت پر مبنی ہیں۔ لیکن وہ اگر سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک کے حقیقی خدوخال کو نہ دیکھ سکے تو "چشمہ آفتاب را چہ گناہ"۔

بعض مسلمان مصنفین نے جس طرح سید شہیدؒ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن پر بے بنیاد اعتراضات عاید کیے ہیں، ان کا جواب محترم المقام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، نے "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" میں جس بصیرت افروز انداز میں دیا ہے اس پر اضافہ ممکن نہیں۔

سید شہیدؒ کا عقیدہ تھا کہ ؎

ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خون شبیرے ندارد!

چنانچہ انھوں نے صدا بلند کی:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری!

اللہ نے اُن کو رسم شبیری پورا کرنے کی سعادت بخشی۔ جنھیں یہ سعادت میسر نہ آسکی انھوں نے اپنی گردنیں عظمت گذشتہ کے ریگ زار میں چھپالیں اور وقت کی یہ پکار اُن کے کانوں تک نہ پہونچ سکی ؎

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی!!
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جنھوں نے آنکھیں کھلی رکھیں وہ بھی اس علمبردار توحید کے مقاصد کو نہ سمجھ سکے، کیونکہ وہ بدعات و احداث کی دنیا میں گم تھے۔ بقول اقبالؔ

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے!

جو خود صنم خانہ بن چکے تھے، اُن تک یہ صدا کیسے پہونچ سکتی تھی۔ انھوں نے نہ رسم ورہ خانقہی کا ناقدانہ جائزہ لیا، نہ اُن کی نوائے سحری کا مقصود سمجھا۔ سید شہیدؒ تصوّف کو "احسان" کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ اُن کو اس کا مخالف بنا کر پیش کرنا حقائق سے چشم پوشی ہے۔ "صراط مستقیم" کے آخری ابواب میں تصوّف کی گمراہیوں کی اصلاح ہے اور "احسان" کو رہبر بنایا گیا ہے۔ "راہ نبوّت" کا انھوں نے جس طرح تجزیہ کیا ہے وہ ان کی فکر کی بنیادی حقیقتوں کو واضح کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں "عبقات" کا عبقہ ۴۲ جس میں "خوش اعتقادوں کی توحید" پر گفتگو کی ہے، لائق مطالعہ ہے۔

بعض معترضین نے سرحدی علاقے کو تحریک کا مرکز بنانے پر اعتراض کیا ہے۔ اُن کو سر ہملٹن گب کا وہ جواب پیش نظر رکھنا چاہیے جو اس نے محمد بن عبدالوہاب کے سلسلہ میں دیا ہے:

"......He had selected as the nucleus of his movement a region which was out of reach of an organised political authority, where there was therefore, an open field for the propagation of his teachings and where, if he were successful, he might be able to build up a strong theocratic organization by the aid of warlike tribesmen."

(Modern Trends In Islam p. 26)

"انھوں نے اپنی تحریک کے مرکز کے لیے ایک ایسے خطّہ کا انتخاب کیا جو کسی مضبوط سیاسی قوّت کی دسترس سے باہر ہو اور جہاں وہ اپنی تعلیمات کو پھیلا سکیں اور کامیابی کی صورت میں ایک مضبوط مذہبی تنظیم جنگجو قبائلیوں کی مدد سے قائم کر سکیں۔"

بعض مصنفین نے تحریک مجاہدین کو محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کا چربہ اور اس سے کلّی طور پر متاثر بتایا ہے۔ یہ خیال بھی اصلاح طلب ہے۔ سیّد شہیدؒ حجاز قیام کے زمانہ میں نجدی تحریک سے واقف ضرور ہوئے اور تنظیمی اعتبار سے ممکن ہے بعض چیزیں قبول بھی کی ہوں، لیکن تحریک کی سمت اس کا مقصد و منہاج، اس کا طریقۂ کار، اس کی فکری اساس ان کی اپنی تھی۔ میں نے ایک مضمون میں جو اسلامک کلچر میں شائع ہوا ہے (جولائی ۱۹۷۰ء) اس پہلو پر مختصراً گفتگو کی ہے۔

بعض معاندین نے حق و صداقت کا دامن اس طرح ہاتھ سے چھوڑ دیا کہ حضرت

سید شہیدؒ پر خود غرضی اور تنگ نظری کے الزام لگانے لگے۔ انھوں نے صحیح تصویر پیش کرنے کا دعویٰ کیا اور حقیقت کو مسخ کر دیا۔ اُن سے تو حالیؔ کا صرف یہ شعر کہا جا سکتا ہے۔

انھوں نے خود غرض شکلیں کبھی دیکھی نہیں شاید
وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم دکھلائیں گے ان کو

بعض معاندین نے عمداً ان کے جنگ آزادی کے عزائم کو غلط پیش کیا، گو بالاکوٹ کی فضائیں پکارتی رہیں۔

مرا بگلچیں بد آموز چمن خواند
کہ دادم چشم نرگس را نگاہے

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی جد و جہد میں سید شہید کے کارنامے کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را